ہندی ادب سے
بھیشم ساہنی

اورامرتسر آ گیا

شمیم فاروقی

5۔امرپالی شاپنگ مارکیٹ،سیکٹر45،نوئیڈا(گوتم بدھ نگر)،موبائل: 9899960618

گاڑی کے ڈبے میں بہت مسافر تھے۔میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے سردار جی دیر سے مجھے جنگ کے قصّے سنا رہے تھے۔وہ جنگ کے زمانے میں برما کی لڑائی میں حصّہ لے چکے تھے اور بات بات پر کبھی کبھی ہنستے اور گورے فوجیوں کی کھلی اُڑا رہے تھے۔ ڈبّے میں تین پٹھان بیوپاری بھی تھے،ان میں سے ایک ہرے رنگ کی پوشاک پہنے اوپر والی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا۔وہ آدمی بڑا ہنس مکھ تھا اور بڑی دیر سے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ایک دبلے سے بابو کے ساتھ اس کا مذاق چل رہا تھا۔وہ دبلا بابو پیشاور کا رہنے والا جان پڑتا تھا کیوں کہ کسی کسی وقت وہ آس پاس میں پشتو میں باتیں کرنے لگتے تھے۔میرے سامنے دائیں طرف کونے میں،ایک بڑھیا منہ ڈھانپے بیٹھی تھی اور دیر سے مالا جپ رہی تھی۔یہی کچھ لوگ رہے ہوں گے۔ممکن ہے دو ایک مسافر اور بھی رہے ہوں پر مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔

گاڑی دھیمی رفتار سے چلی جا رہی تھی اور گاڑی میں بیٹھے مسافر باتیں کر رہے تھے اور باہر گیہوں کے کھیت میں ہلکی ہلکی لہریاں اُٹھ رہی تھیں اور میں من ہی من بڑا خوش تھا کیوں کہ میں دلّی میں ہونے والا یوم آزادی کا پروگرام دیکھنے جا رہا تھا۔

ان دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے،ہم کسی جھٹ پٹے میں جی رہے تھے۔شاید وقت گزر جانے پر ماضی کا سارا کاروبار ہی جھٹ پٹے میں گزرا جان پڑتا ہے۔جوں جوں ماضی کے پٹ کٹتے جاتے ہیں یہ جھٹ پٹا اور بھی گہراتا چلا جاتا ہے۔

انہی دنوں پاکستان کے بنائے جانے کا اعلان کیا گیا تھا اور لوگ طرح طرح کے قیاس لگانے لگتے تھے کہ مستقبل میں زندگی کا رنگ ڈھنگ کیسا ہوگا۔پر کسی کی بھی قیاس آرائی بہت دور تک نہیں جا پاتی تھی۔ میرے سامنے بیٹھے سردار جی بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ پاکستان بن جانے پر جناح صاحب بمبئی میں ہی رہیں گے یا پاکستان میں جا کر بس جائیں گے،اور میرا ہر بار یہی جواب ہوتا،بمبئی کیوں چھوڑیں گے، پاکستان میں آتے جاتے رہیں گے۔بمبئی چھوڑ دینے میں کیا تک ہے۔ لاہور اور گورداس پور کے بارے میں بھی اندازہ لگائے جا رہے تھے کہ کون سا شہر کس کی طرف جائے گا۔مل بیٹھنے کے ڈھنگ میں گپ شپ میں ہنسی مذاق میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔کچھ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر جا رہے تھے جب کہ کچھ لوگ ان کا مذاق اُڑا رہے تھے۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون سا قدم ٹھیک ہوگا اور کون سا غلط!ایک طرف پاکستان بن جانے کا جوش تھا تو دوسری طرف ہندوستان کے آزاد ہو جانے کا جوش۔جگہ جگہ فساد بھی ہو رہے تھے اور یوم آزادی کی تیاریاں بھی چل رہی تھیں۔اس سرزمین میں لگتا دیش آزاد ہو جانے پر دنگے فساد اپنے آپ بند ہو جائیں گے۔ حالات کے اس جھٹ پٹے میں آزادی کی سنہری دھول سی اُڑ رہی تھی،لیکن ساتھ ہی ساتھ بدگمانی کی کیفیت بھی طاری تھی۔شاید جہلم کا اسٹیشن پیچھے چھوٹ چکا تھا۔جب اوپر والی برتھ پر بیٹھے پٹھان نے ایک پوٹلی کھولی اور اُس میں سے اُبلا ہوا گوشت اور روٹیوں کے ٹکڑے نکال نکال کر اپنے ساتھیوں کو دینے لگا۔پھر وہ ہنسی مذاق کے بیچ میری بغل میں بیٹھے بابو کی طرف بھی نان کا ٹکڑا اور گوشت کی بوٹی بڑھا کر کھانے کی دعوت دینے لگا تھا۔''لوکھا لو،بابو طاقت آجائے گی۔ہم جیسا ہو جائے گا۔ بیوی بھی تیرے ساتھ خوش رہے گی۔کھالے دال خور،تو دال کھاتا ہے اسی لیے دبلا ہے.....!

ڈبے میں لوگ ہنسنے لگے تھے۔بابو نے پشتو میں کچھ جواب دیا اور پھر مسکراتا سر ہلاتا رہا،اس پر دوسرے پٹھان نے ہنس کر کہا....او ظالم، امارے آتھ(ہاتھ) سے نئی لیتا اے تو اپنے آتھ سے اُٹھالے۔خدا کی قسم بکرے کا گوشت ہے اور کسی چیز کا نہیں ہے۔اوپر بیٹھا پٹھان چیخ کر بولا۔ اوخنزیر کے تخم،ادھر تمھیں کون دیکھتا ہے؟ ہم تیری بیوی کو نئی بولے گا۔تو امارے ساتھ بوٹی توڑا۔ہم تیرے ساتھ دال پیئے گا....''اس پر قہقہہ اُٹھا، پر دبلا پتلا بابو ہنستا،سر ہلاتا رہا اور کبھی کبھی دو یا تین لفظ پشتو میں بھی کہہ دیتا۔''اوکتنا بُرا بات اے ہم کھاتا اے اور تو ہمارا منہ دیکھتا اے....''سبھی

پٹھان مگن تھے۔

''یہ اس لیے نہیں کہ تم نے ہاتھ نہیں دھوئے ہیں۔'' پاس بیٹھے سردار جی بولے۔ ادھورے انداز میں لیٹے سردار جی کی آدھی تو ندسیٹ کے نیچے لٹک رہی تھی۔ تم سبھی سو کر اُٹھے ہو اور اُٹھتے ہی پوٹلی کھول کر کھانے لگ گئے ہو۔ اسی لیے بابو جی تمہارے ہاتھ سے نہیں لیتے، اور کوئی بات نہیں۔'' اور سردار جی نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور پھر کھی کھی کرنے لگے۔

مانس نہیں کھاتا اے بابو تو جاؤ زنانہ ڈبّے میں بیٹھو ادھر کیا کرتا اے؟ پھر قہقہہ اُٹھا۔ ڈبّے میں اور بھی مسافر تھے، لیکن پرانے مسافر یہی تھے جو سفر شروع ہونے پر گاڑی میں بیٹھے تھے۔ باقی مسافر اُترتے چڑھتے رہے تھے۔ پرانے مسافر ہونے کے ناطے ہی ان میں ایک طرف کی بے تکلفی آ گئی تھی اور..... ''ادھر آ کر بیٹھو..... تم امارے ساتھ بیٹھو..... آؤ ظالم، قصّہ کہانی کی باتیں کریں گے۔''

تبھی کسی اسٹیشن پر گاڑی رُکی تھی اور نئے مسافروں کا ریلا اندر آ گیا تھا۔ بہت سے مسافر ایک ساتھ اندر گھستے چلے آئے تھے۔

''کون سا اسٹیشن ہے؟ کسی نے پوچھا:

''وزیر آباد ہے شاید'' میں نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

گاڑی وہاں تھوڑی دیر کے لیے کھڑی رہی۔ پر چلنے سے پہلے ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا۔ ایک آدمی ساتھ والے ڈبّے میں سے پانی لینے اُترا اور نل پر جا کر پانی لوٹے میں بھر رہا تھا جب وہ بھاگ کر اپنے ڈبّے کی طرف واپس لوٹ آیا۔ چھلکتے لوٹے میں سے پانی گر رہا تھا، لیکن جس ڈھنگ سے وہ بھاگا تھا اس نے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ نل پر کھڑے اور لوگ بھی تین یا چار آدمی رہے ہوں گے۔ ادھر اُدھر اپنے اپنے ڈبّے کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اس طرح گھبرا کر بھاگتے لوگوں کو میں دیکھ چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ فارم خالی ہو گیا، مگر ڈبّے کے اندر ابھی بھی ہنسی مذاق چل رہا تھا۔

''کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔'' میرے پاس بیٹھے دبلے بابو نے کہا:

کہیں کچھ تھا، لیکن کیا تھا، کوئی بھی سچ نہیں جانتا تھا۔ میں کئی دنگے دیکھ چکا تھا اس لیے ماحول میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی کو بھی بھانپ گیا تھا۔ بھاگتے لوگ۔ شور کرتے ہوئے بند دروازے۔ گھروں کی چھتوں پر کھڑے لوگ، خاموشی اور سناٹا یہ سب ہی دنگوں کی نشانیاں تھیں! تب ہی پچھلے دروازے کی طرف سے، جو پلیٹ فارم کی طرف نہیں کھول کر دوسری طرف کھولتا تھا۔ اس طرف سے ہلکا سا شور ہوا۔ کوئی مسافر اندر گھسنا چاہ رہا تھا۔

''کہاں گھسا آ رہا ہے۔ نہیں ہے جگہ..... بول دیا جگہ نہیں ہے۔'' کسی نے کہا۔

جتنی دیر کوئی مسافر ڈبّے کے باہر کھڑا اندر آنے کی کوشش کرتا رہے۔ اندر بیٹھے مسافر اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں، لیکن ایک بار جیسے تیسے وہ اندر آ جائے تو مخالفت ختم ہو جاتی ہے اور وہ مسافر جلدی ہی ڈبّے کی دنیا کا حصّہ بن جاتا ہے اور اگلے اسٹیشن پر وہی سب سے پہلے باہر کھڑے مسافروں پر چلانے لگتا ہے۔ ''نہیں ہے جگہ..... اگلے ڈبّے میں جاؤ..... گھسے آتے ہیں.....''

دروازے پر شور بڑھتا جا رہا تھا۔ تبھی میلے کچیلے کپڑوں اور لٹکتی مونچھوں والا ایک آدمی دروازے میں سے اندر گھستا دکھائی دیا۔ ضرور کہیں حلوائی کی دکان کرتا ہوگا۔ وہ لوگوں کی شکایتوں، آوازوں کی طرف توجہ دیے بنا دروازے کی طرف بڑا سا کالے رنگ کا صندوق اندر کی طرف گھسیٹنے لگا۔

''آ جاؤ..... آ جاؤ تم بھی چڑھ آؤ۔ وہ اپنے پیچھے کسی کو کہے جا رہا تھا۔ تبھی دروازے میں ایک پتلی، سوکھی سی عورت نظر آئی اور اس کے پیچھے سولہ سترہ برس کی ایک سانولی سی ایک لڑکی اندر آ گئی۔ لوگ ابھی بھی چلائے جا رہے تھے۔ سردار جی کو کولہوں کے بل اُٹھ کر بیٹھنا پڑا۔

''بند کرو جی دروازہ، بنا پوچھے چڑھے آتے ہیں، اپنے باپ کا گھر سمجھ رکھا ہے۔ مت گھسنے دو جی.... کیا کرتے ہو۔ دھکیل دو پیچھے.....'' اور لوگ بھی چلا رہے تھے۔

وہ آدمی اپنا سامان اندر گھسیٹے جا رہا تھا اور ان کی پتنی اور بیٹی پاخانے کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھیں۔

''اور کوئی ڈبّہ نہیں ملا؟ عورت ذات کو بھی یہاں اُٹھا لایا ہے۔''

وہ آدمی پسینے سے تر تھا اور ہانپتا ہوا سامان اندر سمیٹے جا رہا تھا۔ صندوق کے بعد رسیوں سے بندھی گھاٹ کی پٹیاں اندر کھینچنے لگا۔

''ٹکٹ ہے جی ہمارے پاس، میں بے ٹکٹ نہیں ہوں۔'' لاچاری ہے..... شہر میں دنگا ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے اسٹیشن تک پہنچا ہوں۔ اس پر ڈبّے میں بیٹھے بہت سے لوگ چپ ہو گئے۔ پر برتھ پر بیٹھا پٹھان اُچک کر بولا۔ ''نکل جاؤ ادھر سے۔ دیکھتا نہیں ادھر جگہ نہیں ہے۔'' اور پٹھان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آگے بڑھ کر اوپر سے ہی مسافر کو لات جمادی پر لات اس آدمی کو لگنے کے بجائے اس کی بیوی کے کلیجے میں لگی اور وہ وہیں ہائے ہائے کرتی بیٹھ گئی۔

اُس آدمی کے پاس مسافروں سے اُلجھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ

برابر اپنا سامان اندر گھسیٹے جا رہا تھا۔ پر ڈبّے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کھاٹ کی پٹیوں کے بعد بڑی بڑی گٹھریاں آئیں۔ اس پر اوپر بیٹھے پٹھان کی برداشت نے جواب دے دیا۔ ''نکالو اسے یہاں سے کون اے یہ؟'' وہ چلایا۔ اس پر دوسرے پٹھان نے جو نیچے کی سیٹ پر بیٹھا تھا اس آدمی کا صندوق دروازے میں سے نیچے دھکیل دیا۔ جہاں لال وردی والا ایک قلی کھڑا سامان اندر پہنچا رہا تھا۔

اس کی بیوی کے چوٹ لگنے پر کچھ مسافر چپ ہو گئے تھے۔ صرف کونے میں بیٹھی ایک بڑھیا بڑبڑائے جا رہی تھی۔ ''اے نیک بختو بیٹھنے دو۔ آ جا بیٹی تو میرے پاس آ جا۔ جیسے.... تیسے.... سفر کاٹ لیں گے۔ چھوڑ دیے ظالمو! بیٹھنے دو۔'' ابھی آدھا ہی سامان اندر آیا ہوگا کہ اچانک گاڑی سرکنے لگی۔ ''چھوٹ گیا۔ سامان چھوٹ گیا۔'' وہ آدمی بدحواس سا ہو کر چلایا۔ ''پتا جی! سامان چھوٹ گیا۔'' پاخانے کے دروازے کے پاس کھڑی لڑکی سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی اور چلائے جا رہی تھی۔

اُترو نیچے اُترو.... وہ آدمی بڑبڑا کر چلایا اور آگے بڑھ کر کھاٹ کی پٹیاں اور گٹھریاں باہر پھینکتے ہوئے دروازے کا ڈنڈا پکڑ کر نیچے اُتر گیا۔ اُس کے پیچھے اُس کی ہراساں بیٹی اور اس کی بیوی سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ہائے ہائے کرتی نیچے اُتر گئیں۔

''بہت بُرا کیا ہے تم لوگوں نے..... بہت برا کیا ہے۔'' بڑھیا اونچا اونچا بول رہی تھی۔ تمہارے دل میں درد لگا ہے یا نہیں۔'' چھوٹی سی بچی اس کے ساتھ تھی۔ ''بے رحمو! تم نے بہت برا کیا ہے۔ دھکّے دے کر اُتار دیا ہے۔'' گاڑی سونے پلیٹ فارم کو لانگتی آگے بڑھ گئی۔ ڈبّے میں بے چین سی خاموشی طاری تھی۔ بڑھیا نے بولنا بند کر دیا تھا۔ پٹھانوں کی مخالفت کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوئی۔

تبھی میری بغل میں بیٹھے دبلے بابو نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''آگ ہے۔ دیکھو آگ لگی ہے۔'' گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ کر آگے نکل آئی تھی۔ اسٹیشن پر بھی لوگ بھاگ رہے تھے۔ کہیں دنگا ہو رہا ہے شہر میں آگ لگی تھی۔ بات ڈبّے بھر میں مسافروں کو پتہ چل گئی اور وہ لپک لپک کر کھڑکیوں میں سے آگ کا منظر دیکھنے لگے۔

جب گاڑی شہر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تو ڈبّے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے گھوم کر ڈبّے کے اندر دیکھا، دُبلے بابو کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا اور ماتھے پر پسینے کی پرت کسی مردے کے ماتھے کی طرح چمک رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے سبھی مسافروں نے اپنے آس پاس بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے لیا ہے۔ سردار جی اُٹھ کر میری سیٹ پر آ بیٹھے۔ نیچے والی سیٹ پر بیٹھا پٹھان اُٹھا اور اپنے دو ساتھی پٹھانوں کے ساتھ اوپر والی برتھ پر چڑھ گیا۔ یہی کیفیت شاید ریل گاڑی کے دیگر ڈبّوں کی بھی ہوگی۔ ڈبّے میں تناؤ آ گیا۔ لوگوں نے باتیں کرنا بند کر دی تھیں۔ تینوں کے تینوں پٹھان اوپر والی برتھ پر ایک ساتھ بیٹھے چپ چاپ نیچے کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ سبھی مسافروں کی آنکھیں پہلے سے زیادہ کھلی کھلی زیادہ سہمی سی لگیں۔ غالباً ایسا ہی منظر گاڑی کے تمام ڈبّوں کا رہا ہوگا۔

''کون سا اسٹیشن تھا یہ'' ڈبّے میں کسی نے پوچھا! ''وزیر آباد'' کسی نے جواب دیا۔ جواب سننے پر ڈبّے میں ایک اور تبدیلی آئی۔ پٹھانوں کے من کا تناؤ فوراً ڈھیلا پڑ گیا۔ جب کہ ہندو، سکھ مسافروں کی خاموشی اور زیادہ گہری ہو گئی۔ ایک پٹھان اپنی واسکٹ کی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی اور ناک میں نسوار چڑھانے لگا۔ دوسرے پٹھان بھی اپنی اپنی ڈبیا نکال کر نسوار چڑھانے لگے۔ بڑھیا برابر مالا جپ رہی تھی۔ کسی کسی وقت اس کے بدبداتے ہونٹ نظر آتے، لگتا ان میں سے کوئی کھوکھلی آواز نکل رہی ہے۔ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رُکی تو وہاں بھی سناٹا تھا۔ کوئی پرندہ تک نہیں پھڑک رہا تھا۔ ہاں ایک بہشتی پیٹھ پر پانی کی مشک لادے، پلیٹ فارم پھلانگ کر آیا اور مسافروں کو پانی پلانے لگا۔ ''لو.... پیو.... پانی پیو۔'' عورتوں کے ڈبّے میں سے عورتوں اور بچوں کے کئی ہاتھ باہر نکل آئے تھے۔ ''بہت مار کاٹ ہوئی ہے۔ بہت لوگ مرے ہیں۔'' لگتا تھا، وہ اس مار کاٹ میں اکیلا ثواب کمانے چلا آیا ہے۔ گاڑی سرکی تو کھڑکیوں کے پلے چڑھائے جانے لگے۔ دور دور تک، پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ کھڑکیوں کے پلے چڑھنے کی آواز آنے لگی۔

کسی گہری سوچ میں ڈوبا دبلا بابو میرے پاس والی سیٹ پر سے اُٹھا اور دو سیٹوں کے بیچ فرش پر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ ابھی بھی مردے جیسے پیلا ہو رہا تھا۔ اس پر برتھ پر بیٹھا پٹھان اس سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔ ''او بے غیرت.... تم مرد ہے کہ عورت ہے؟ سیٹ پر سے اُٹھ کر نیچے لیٹتا ہے۔ تم مرد کے نام کو بدنام کرتا ہے۔ وہ بول رہا تھا اور بار بار ہنسے جا رہا تھا۔ پھر وہ اس سے پشتو میں کچھ کہنے لگا۔ بابو چپ چاپ لیٹا رہا۔ دوسرے سب ہی مسافر چپ تھے۔ ڈبّے کا ماحول بوجھل بنا ہوا تھا۔

''ایسے آدمی کو ام ڈبّے میں بیٹھنے نئی دے گا۔ او بابو تم اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤ اور زنانہ ڈبّے میں بیٹھو۔'' مگر بابو کی حاضر جوابی اپنے اندر دب چکی تھی۔ ہکلا کر چپ ہو رہا۔ پر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آپ سیٹ پر جا بیٹھا اور دیر تک اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑتا رہا۔ وہ کیوں اُٹھ کر فرش پر لیٹ گیا تھا؟ شاید اُسے ڈر تھا کہ باہر سے گاڑی پر پتھراؤ ہوگا یا گولی چلے گی، شاید

اسی وجہ سے کھڑکیوں کے پلے چڑھائے جارہے تھے۔

کچھ بھی کہنا مشکل تھا۔ ممکن ہے کہ کسی ایک مسافر نے کسی وجہ سے کھڑکی کا پلّہ چڑھایا ہو اور اس کی دیکھا دیکھی بنا سوچے سمجھے دھڑا دھڑ کھڑکیوں کے پلے چڑھائے جانے لگے ہوں۔ بوجھل سے ان دیکھے خوف کے ماحول میں سفر کٹنے لگا۔ رات گہری ہوتی جارہی تھی۔ ڈبّے کے مسافر خاموش فکرمند جوں کے توں بیٹھے تھے۔ گاڑی کی رفتار کبھی ہلکی پڑجاتی تو لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے۔ کبھی راستے میں ہی رُک جاتی تو ڈبّے کے اندر کا سناٹا اور بھی گہرا ہوجاتا۔ صرف پٹھان بےفکر بیٹھے تھے۔ ہاں انھوں نے بھی باتیں کرنا بند کردی تھیں۔ کیوں کہ ان کی بات چیت میں کوئی بھی شامل ہونے والا نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے پٹھان اونگھنے لگے جب کہ دیگر مسافر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں دیکھے جارہے تھے۔ بڑھیا منہ سر لپیٹے ٹانگیں سیٹ پر چڑھائے بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔ اوپر والی برتھ پر ایک پٹھان نے ادھوری حالت میں لیٹے لیٹے اپنے کرتے کی جیب میں سے کالے دانوں کی تسبیح نکال لی اور اسے دھیرے دھیرے ہاتھ میں چلانے لگا۔ کھڑکی کے باہر آسمان میں چاند نکل آیا تھا۔ کسی کسی وقت دور کسی طرف آگ کے شعلے اُٹھتے نظر آتے، کوئی نگر جل رہا تھا۔ گاڑی کسی وقت چنگھاڑتی آگے بڑھنے لگتی۔ پھر کسی وقت اس کی رفتار سُست پڑجاتی اور میلوں تک دھیمی رفتار سے ہی چلتی رہتی۔

اچانک دبلا بابو کھڑکی میں سے باہر دیکھ کر اونچی آواز میں بولا۔ ''ہربنس پورہ نکل گیا ہے۔'' اس کی آواز میں جوش تھا وہ جیسے چیخ کر بولا تھا۔ ڈبّے کے بھی لوگ اس کی آواز سن کر چونک گئے۔ اسی وقت ڈبّے کے زیادہ تر مسافروں نے اس کی آواز کو ہی سن کر کروٹ بدلی۔

''اوے بابو چلاتا کیوں ہے۔'' تسبیح والا پٹھان چونک کر بولا۔ اُدھر اُترے گا تم؟..... زنجیر کھینچوں؟ اور کھی کھی کرکے ہنس دیا۔ ظاہر ہے وہ ہربنس پورہ کی حالت اور اس کے نام سے اچھی طرح واقف تھا۔ بابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف سر ہلا دیا اور ایک آدھ بار پٹھان کی طرف دیکھ کر پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ ڈبّے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ تبھی انجن نے ایک سیٹی دی اور اس کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر میں کھٹاک کی آوازیں آئیں۔ شاید گاڑی نے لائن بدلی تھی۔ بابو نے جھانک کر اس طرف دیکھا جس طرف گاڑی بڑھ رہی تھی۔

شہر آگیا ہے.... وہ پھر اونچی آواز میں چلایا۔ امرتسر آگیا ہے۔ اس نے پھر سے کہا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا اور اوپر والی برتھ پر لیٹے پٹھان کو مخاطب کرکے چلایا۔ ''اوبے پٹھان کے بچے۔ نیچے اُتر تیری ماں کی.... نیچے اُتر، تیری اس پٹھان بتانے والے کی میں.....''

بابو چلانے لگا تھا اور چیخ چیخ کر گالیاں بکنے لگا تھا۔ تسبیح والے پٹھان نے کروٹ بدلی اور بابو کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''او کیا اے بابو! ام کو کچھ بولا؟'' بابو کو بھڑکتے دیکھ کر دیگر مسافر بھی اُٹھ بیٹھے۔

''نیچے اُتر تیری میں.....'' ہندو عورتوں کو لات مارتا ہے۔ حرام زادے، تیری اُس.....'' او بابو بک بک نئی کرو۔ او خنزیر کے تخم، گالی مت بکو۔ اُم نے بول دیا۔ ام تمہارا زبان کھینچ لے گا۔''

''گالی دیتا ہے مادر.....'' بابو چلایا اور اچھل کر سیٹ پر چڑھ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ''بس بس'' سردار جی بولے۔ ''یہ لڑنے کی جگہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کا سفر باقی ہے۔ آرام سے بیٹھو۔''

''تیری میں لات نہ توڑوں تو کہنا۔ گاڑی تیرے باپ کی ہے؟'' بابو چلایا۔

''او ام نے کیا بولا۔ سبھی لوگ اس کو نکالتا تھا، ام نے بھی نکالا۔ یہ اِدر ہم کو گالی دیتا اے۔ ام اس کا زبان کھینچ لے گا۔'' بڑھیا بیچ میں پھر بول اُٹھی۔ ''وے جین جو گیو۔ آرام نال بیٹھو۔ وے رب دیے بندو۔ کچھ ہوش کرو۔'' بابو چلائے جارہا تھا۔ اپنے گھر میں شیر بنتا تھا۔ اب بول تیری میں اس پٹھان بنانے والے کی.....''

تب ہی گاڑی امرتسر پلیٹ فارم پر رُکی۔ پلیٹ فارم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ جھانک جھانک کر ڈبّے کے اندر دیکھنے لگے۔ بار بار لوگ ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے۔ ''پیچھے کیا ہوا؟ کہاں پر دنگا ہوا ہے۔'' کھچا کھچ بھرے پلیٹ فارم پر شاید اسی بات کا چرچا چل رہا تھا کہ پیچھے کیا ہوا ہے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے دو تین خوانچے والوں پر مسافر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ سبھی کو بھوک اور پیاس پریشان کرنے لگی تھی۔ اسی دوران تین چار پٹھان ہمارے ڈبّے کے باہر نمودار ہوگئے اور کھڑکی میں سے جھانک جھانک کر اندر دیکھنے لگے۔ اپنے پٹھان ساتھیوں پر نظر پڑتے ہی وہ ان سے پشتو میں کچھ بولنے لگے۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ بابو ڈبّے میں نہیں تھا۔ نہ جانے کب وہ ڈبّے میں سے نکل کر چلا گیا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ غصّے سے وہ پاگل ہوا جارہا تھا۔ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ پر اسی دوران ڈبّے کے تینوں پٹھان اپنی اپنی کٹھری اُٹھا کر باہر نکل گئے اور اپنے پٹھان ساتھیوں کے ساتھ گاڑی کے اگلے کسی اور ڈبّے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ جو تفریق پہلے ڈبّے کے اندر نظر آرہی تھی وہ اب ساری گاڑی میں نظر آرہی تھی۔

خوانچے والوں کے اردگرد بھیڑ چھٹنے لگی۔ لوگ اپنے اپنے ڈبوں

میں لوٹنے لگے۔ تب ہی اچانک ایک طرف سے مجھے وہ بابو آتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ ابھی بھی بہت پیلا تھا اور ماتھے پر بالوں کی لٹیں جھول رہی تھیں۔ نزدیک پہنچا تو میں نے دیکھا، اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں لوہے کی ایک چھڑ لے رکھی تھی۔ جانے وہ اُسے کہاں سے مل گئی تھی؟ ڈبّے میں گھستے وقت اس نے چھڑ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے سے قبل وہ ہولے سے چھڑ کی طرف دیکھنے لگا۔

''نکل گئے حرامی، مادر.....سب کے سب نکل گئے۔'' پھر وہ سٹ پٹا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چلا کر بولا۔ ''تم نے انھیں جانے کیوں دیا؟ تم سب نامرد ہو۔ بزدل۔'' پر گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ بہت سے نئے مسافر آ گئے تھے۔ کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ گاڑی سرکنے لگی تو وہ پھر میری بغل والی سیٹ پر آ بیٹھا، پر وہ بڑا غصّہ میں تھا اور برابر بڑبڑائے جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے ہچکولے کھاتے گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ ڈبّے کے پرانے مسافروں نے پھر پوریاں کھالی تھیں اور پانی پی لیا تھا اور گاڑی اس علاقے سے آگے بڑھنے لگی تھی۔ جہاں ان کی جان و مال کو خطرہ نہیں تھا۔ نئے مسافر باتیں کر رہے تھے۔ دھیرے دھیرے گاڑی رفتار پکڑنے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد لوگ اونگھنے لگے تھے، مگر بابو ابھی بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ بار بار مجھ سے پوچھتا کہ پٹھان ڈبّے میں سے نکل کر کس طرف گئے ہیں۔ اس کے سر پر جنون سوار تھا۔

گاڑی کے ہچکولوں میں، خود اونگھنے لگا تھا۔ ڈبّے میں سیٹ پانے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے ہی نیند میں میرا سر کبھی ایک طرف کو لڑھک جاتا کبھی دوسری طرف کو۔ کسی کسی وقت جھٹکے سے میری نیند ٹوٹ جاتی اور مجھے سامنے کی سیٹ پر بے ڈھنگے پڑے سردار جی کے خراٹے کی آواز سنائی دیتی۔ امرتسر پہنچے کے بعد سردار جی پھر سے سامنے والی سیٹ پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گئے۔ ڈبّے میں آڑی ترچھی حالت میں مسافر پڑے تھے۔ ان کی مختلف حالتوں کو دیکھ کر لگتا جیسے ڈبّہ لاشوں سے بھرا ہے۔ پاس بیٹھے بابو پر نظر پڑتی تو کبھی وہ کھڑکی کے باہر منہ کیے دیکھ رہا ہوتا۔ کبھی دیوار سے پیٹھ لگائے تن کر بیٹھا نظر آتا۔ کسی کسی وقت گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکتی تو پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ بند ہونے پر لگتا جیسے پلیٹ فارم پر کچھ گرا ہے۔ یا جیسے کوئی مسافر گاڑی میں سے اترا ہے اور میں جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اسی طرح ایک بار جب میری نیند ٹوٹی تو گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی اور ڈبّے میں اندھیرا تھا۔ میں نے اسی طرح اوندھے لیٹے لیٹے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ دور پیچھے کی طرف کسی اسٹیشن کے سگنل کے لال قمقمے چمک رہے تھے۔ جس سے صاف ہو گیا گاڑی کوئی اسٹیشن لانگھ کر آئی تھی پر ابھی تک اس نے رفتار نہیں پکڑی تھی۔ ڈبّے کے باہر مجھے کچھ سرگوشیوں کی آواز سنائی دی اور ایک بڑا سا کالا سایہ سا نظر آیا۔ نیند کی خماری میں میری آنکھیں کچھ دیر تک اس سایہ پر لگی رہیں۔ پھر میں نے اسے سمجھ پانے کا خیال چھوڑ دیا۔ ڈبّے کے اندر اندھیرا تھا۔ بتیاں بوجھی ہوئی تھیں، لیکن باہر لگتا تھا پو پھٹنے والی ہے۔ میری پیٹھ کے پیچھے ڈبّے کے باہر کسی چیز کو کھرچنے کی سی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ڈبّے کا دروازہ بند تھا۔ مجھے پھر سے دروازہ کھرچنے کی آواز سنائی دی۔ پھر میں نے صاف صاف سنا۔ لاٹھی سے کوئی شخص ڈبّے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے جھانک کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ سچ مچ ایک آدمی ڈبّے کی دو سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک گٹھری جھول رہی تھی اور ہاتھ میں لاٹھی تھی اور اس نے بدرنگے سے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کی داڑھی تھی پر میری نظر باہر نیچے کی طرف گئی۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ ایک عورت بھاگتی چل رہی تھی۔ ننگے پاؤں اور اس نے دو گٹھریاں اُٹھا رکھی تھیں۔ بوجھ کی وجہ سے دوڑا نہیں جا رہا تھا۔ ڈبّے کے پائیدان پر کھڑا آدمی بار بار اس کی طرف مُڑ کر دیکھ رہا تھا اور ہانپتا ہوا کہے جا رہا تھا۔ آ.....جا.....آ.....جا.....تو بھی چڑھ.....آ.....آ جا۔ دروازے پر پھر سے لاٹھی سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ ''کھولو جی دروازہ خدا کے واسطے دروازہ کھولو۔'' وہ آدمی ہانپ رہا تھا۔ خدا کے لیے دروازہ کھولو۔ میرے ساتھ میں عورت ذات ہے۔ گاڑی نکل جائے گی۔''

اچانک میں نے دیکھا بابو ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کے پاس جا کر دروازے میں لگی کھڑکی میں سے منہ باہر نکال کر بولا۔ ''کون ہے؟ ادھر جگہ نہیں ہے۔'' باہر کھڑا آدمی پھر گڑگڑانے لگا۔ خدا کے واسطے گاڑی نکل جائے گی اور وہ آدمی کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ اندر ڈال کر دروازہ کھول پانے کے لیے چٹخنی ٹٹولنے لگا۔

''نہیں ہے جگہ۔ بول دیا....اُتر جاؤ گاڑی پر سے۔'' بابو چلایا اور اُسی پل اس نے دروازہ بھی کھول دیا۔ یا اللہ....اُس آدمی کے آدھے ادھورے لفظ سنائی دیے دروازہ کھولنے پر جیسے اس نے اطمینان کی سانس لی ہو، لیکن اُسی وقت میں نے بابو کے ہاتھ میں چمکتی چھڑ کو دیکھا۔ ایک ہی بھرپور وار بابو نے اس زور سے کیا کہ وہ ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے جو دروازے کے ڈنڈے کو پکڑے ہوئے تھے۔ کندھے پر لٹکی گٹھری کھسک کر اس کی کہنی پر آ گئی تھی!

تب ہی اچانک اُس کے چہرے پر خون کی دو تین دھاریں ایک ساتھ پھوٹ پڑیں۔ جھرمٹ میں مجھے اس کے کھلے ہونٹوں پر چمکتے دانت

نظر آئے۔ وہ ایک بار یا اللہ بڑ بڑایا پھر اس کے پیر لڑکھڑا گئے۔ اس کی آنکھوں نے بابو کی طرف دیکھا۔ وہ موندی سی آنکھیں جو دھیرے دھیرے مسکراتی جارہی تھیں۔ مانو اسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہوں کہ وہ کون ہے اور اس سے کس عداوت کا بدلہ لیا جارہا ہے۔ اس دوران اندھیرا کچھ اور چھن گیا تھا۔ اس کے ہونٹ پھر سے پھڑ پھڑائے ان میں اس کے سفید دانت پھر سے جھلک اُٹھے۔ مجھے لگا جیسے وہ مسکرایا ہے، مگر حقیقت میں تکلیف کی وجہ سے اُس کے ہونٹ سکڑنے لگے تھے۔ نیچے سیڑھی کے ساتھ ساتھ دوڑتی عورت بڑبڑائے اور کوستی جارہی تھی۔ اُسے ابھی بھی معلوم نہیں ہو پایا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ وہ ابھی بھی شاید یہی سمجھ رہی تھی کہ گٹھری کی وجہ سے اس کا شوہر گاڑی پر ٹھیک طرح سے چڑھ نہیں پارہا ہے یا اس کا پیر جم نہیں پارہا تھا۔ وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی اپنی دو گٹھریوں کے باوجود اپنے شوہر کے پیر کو پکڑ پکڑ کر سیڑھی پر ٹکانے کی کوشش کررہی تھی۔

تب ہی اچانک دروازے کے ڈنڈے سے اُس آدمی کے دونوں ہاتھ چھوٹ گئے اور وہ کٹے پیڑ کی مانند نیچے جا گرا اور اس کے گرتے ہی عورت نے بھاگنا بند کردیا۔ مانو دونوں کا سفر ایک ساتھ ہی ختم ہوگیا ہو۔

بابو ابھی بھی میرے نزدیک ڈبّے کے کھلے دروازے میں بُت کا بُت بنا کھڑا تھا۔ لوہے کی چھڑ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ چھڑ کو پھینک دینا چاہتا ہے، لیکن اسے پھینک نہیں پارہا تھا۔ میری سانس ابھی بھی پھولی ہوئی تھی اور ڈبّے کے اندر کونے میں، میں کھڑکی کے ساتھ چپک کر بیٹھا اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

بابو پھر کھڑے کھڑے بلا کسی انجانے خوف میں ایک قدم آگے بڑھ کر دروازے میں سے پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ گاڑی آگے نکلتی جارہی تھی۔ بابو کا شریر حرکت میں آیا۔ ایک جھٹکے میں اس نے چھڑ کو ڈبّے کے باہر پھینک دیا۔ پھر گھوم کر ڈبّے کی دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ سب ہی مسافر سوئے پڑے تھے۔ میری طرف اس کی نظر نہیں اُٹھی۔ تھوڑی دیر تک وہ کھڑا ڈولتا رہا، پھر گھوم کر دروازہ بند کردیا۔ اس نے دھیان سے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ پھر ایک ایک کرکے دونوں ہاتھوں کو ناک کے پاس لے جاکر انھیں سونگھا، مانو۔ جاننا چاہتا ہو کہ اس کے ہاتھوں سے خون کی بو تو نہیں آرہی ہے پھر وہ دبے پاؤں چلتا ہوا آیا اور میری بغل والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

دھیرے دھیرے سویرا ہونے لگا۔ صاف ستھری سی روشنی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ کسی نے زنجیر کھینچ کر گاڑی کو روکوانے کی کوشش نہیں کی۔ سر پر لوہے کی چھڑ کھا کر گرنے والے کا مردہ جسم پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ سامنے گیہوں کے کھیتوں میں پھر سے ہلکی ہلکی لہریاں اُٹھنے لگی تھیں۔ سردار جی بدن کھجلاتے اُٹھ بیٹھے میری بغل میں بیٹھا بابو دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے سامنے کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ رات بھر میں اس کے چہرے پر چھوٹے چھوٹے بال اُگ گئے تھے۔ اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر سردار جی بابو سے ازخود باتیں کرنے لگا۔ بڑے جیوٹ ہو بابو دُبلے پتلے ہو پر بڑے گردے والے ہو۔ بڑی ہمت دکھائی ہے۔ تمہارے سے ڈر کر ہی وہ پٹھان ڈبّے میں سے نکل گئے۔ یہاں رہتے تو ایک نہ ایک کی کھوپڑی تم ضرور درست کردیتے اور سردار جی ہنسنے لگے۔ بابو کے ہونٹوں پر ہلکی سی فاتحانہ ہنسی جھول رہی تھی۔

○○

ابن صفی: شخصیت اور فن کے آئینے میں

اردو ادب میں ابن صفی کی گراں قدر خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں مگر ان کی خدمات کا اعتراف بہت کم ہوا ہے۔ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام ذہنی تحفظات سے بلند ہوکر معروضی انداز میں ان کے ادبی مقام کا تعین کیا جائے تاکہ نئی نسلیں ان کی تخلیقی فتوحات سے واقف ہوسکیں اور ان کے لائقِ رشک طرزِ نگارش، غیر معمولی حسِ مزاح، ذہانت، ذکاوت اور حیرت انگیز زود نویسی کے باوصف فکر وفن کی تازگی کو برقرار رکھنے کی زبردست صلاحیت کا ادراک واحساس کرسکیں۔ ایسے ہر دلعزیز تخلیق کار کا کھلے دل سے اعتراف کرنے کے لیے اردو اکادمی، دہلی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس سمینار کے بیس فکر انگیز مقالات پر مشتمل یہ کتاب قارئین کے لیے مفید مطلب بھی ہے اور وقت کی اہم ضرورت بھی۔

مرتبین: خالد محمود، خالد جاوید، صفحات: ۲۴۸، قیمت: ۱۵۰ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی